

Khalah Bi خالہ بی

[خالہ بی جب بھی سالن بناتیں اس میں مٹھی بھر کے زیرہ ڈال دیتی تھیں۔ اس زیرے کا سواد بڑا ہی نرالہ تھا۔ لیکن سبزیوں کو زیرے کا بگھار دے کر اس میں شوربا بنانا ان کی ایک عجیب عادت تھی۔ اس علاقے میں ایسا کھانا کوئی نہ بناتا تھا۔ سب گھروں میں مرغن غذائیں پکنتیں اور مسالے کے نام پر سرخ مرچوں کی بھری انڈیل دی جاتی۔ سبزیوں کو پکا پکا کر ان کی ایسی حالت بنائی جاتی کہ کھانے والے کو بوجھنا کسی پہیلی کی طرح مشکل لگتا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بینگن پکے ہیں۔ گوبھی ہے یا کدو۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ اور جب خالہ بی پکا تیں تو ترکاری بھی پہچان جاتی اور پکانے والا بھی معلوم ہو جاتا۔ ایک دن وہ باغ میں ساگ پات چن رہی تھیں کہ میرا ان سے سامنا ہو گیا۔ میرا نفس مجھے اکسانے لگا کہ ان کے پکانے کے اس عجیب انداز کی کھوج لگاؤں۔ روایتوں میں رہ کر روایت سے ہٹنا کوئی معمولی بات تو تھی۔ پھر ایسی کیا عادت بنی کہ پختہ ہی ہوگئی۔ میں خالہ جی سے پوچھنے لگی کہ۔ آپ نے ایسا کھانا کب پکانا شروع کیا اور آپ کی زبان کو یہ ذائقہ کب سے لگا ہے؟“ بس پھر کیا تھا اک داستان کرب تھی ان کا ضبط توڑ دیا تھا اور اب تھامنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں بہت چھوٹی سی تھی کہ دوسرے گاؤں سے چند لوگ مجھے دیکھنے آئے۔ میں انہیں پہلی ہی ملاقات میں بھا گیا۔ اور چند روز بعد نکاح کر کے وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت میں عقد نکاح کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتی تھی۔ بس یہی معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن لڑکیوں کو دوسرے گھر جانا پڑتا ہے۔ میں خوش تھی۔ نہ خفا نہ مطمئن اور نہ ہی بے قرار تھی۔ بس وقت کے دھارے کے ساتھ خود کو ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا شوہر اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری ساس بہت خوش تھیں اور بہت مان سے مجھے بیاہ کے لیے جارہی تھیں۔ منزل مقصود پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شوہر کو چھٹی نہیں ملی، اس لیے اسے جانا پڑا ہے۔ رات تک شاید لوٹ آئے گا۔ اس زمانے میں قریبی شہروں کے سفر بھی بے اعتبار ہوتے تھے۔ مسافقوں کی مدت تو یوں بھی کوئی نہیں جانتا۔ وہ رات گزری، پھر دوسری رات، پھر تیسری رات اور پھر کئی راتیں گزرتی گئیں۔ اجنبی مسافر کے لوٹنے کی امید ختم ہوئی گئی۔ مجھے ایک غم تھا اور ماں کو دوع۔ بیٹا بھی گھر نہیں لوٹا اور پرانی بیٹی کو بھی لا کر گھر بٹھا لیا۔ لیکن غم کھانے سے غم کا مداوا کہاں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ گزرا تو کہیں سے اطلاع ملی کہ شادی والے دن جب وہ دفتر گیا تو اس کی وہاں کسی سے تکرار ہوئی۔ اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی اور دفتر کا خاکروب اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ انگریز صاحبوں کا دور تھا۔ اور خاکروب ان کے ہم مذہب تھے۔ مسلمان ملازمین کی دفتروں میں حیثیت بہت پتلی ہوا کرتی تھی۔ جب غصہ حد سے بڑھ گیا تو خاکروب پر نکلا۔ اس سے لڑ کر وہ خان صاحب بھاگ نکلے تاکہ تھانہ کچہری سے بچ جائیں۔ عمر کے وہ بھی کچے تھے۔ قرار میں کچھ زیادہ ہی غائب ہو گئے۔ اس کہانی کے معلوم ہونے کے بعد گھر میں انتظار اور بے قراری اور بڑھ گئی۔ انتظار کی آگ بھوک کی آگ میں بدل گئی نہ رہا کہ کب بی آگ گھر کا واحد کمانے والا تو نہ جانے کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اسے تلاش کرنے سے بہتر تھا کہ اپنے لیے رزق تلاش کریں۔ دو وقت کی روٹی کے لیے میں نے اور ماں نے محنت مزدوری شروع کر دی۔ گھیتوں میں کام کیا۔ چرخا کا تاشالیں بنتے رہے۔ اپنے تھاپے۔ تندور پر روٹیاں لگائیں۔ غرض اپنی ساری حیثیت بھلا کر اس ایک چیز کو بادرکھا کہ ابھی ہم ضرورت مند ہیں لیکن محتاج نہیں ہیں۔ ضرورت مند ہو نا کوئی عیب نہیں ہوتا۔ لیکن اپنے لیے کچھ نہ کر سکتا کمزوری ہوتی ہے۔ اب میں عمر کے ایسے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔ جہاں مجھے شعور بہت کچھ سکھارہا تھا۔ اور تجربے سے مجھے پختہ کر رہے تھے۔ میں ایک مضبوط عورت کے روپ میں ابھرنا چاہتی تھی۔ تاکہ کوئی مجھے ترس کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ مجھے سہارا دے کر کھڑا کرنے والی ماں اب ڈھے رہی تھی۔ اس کے اعصاب اور بدن میں اب وہ توانائی تھی۔ نہ احساس غم نہ محرومی اور نہ ہی میرے حوالے سے کوئی احساس جرم۔ ماں نے بڑھاپے میں قدم رکھا تو تقدیر کا لکھا سمجھ کر سب قبول کر لیا۔ اب اس تقدس کی ماری کی بیساکھی مجھے بنا تھا۔ میرے سامنے اگر اس بوڑھی ماں کی مثال موجود نہ ہوتی تو شاید میں بار جاتی لیکن وہ زندہ مثال مجھے بار نے نہ دیتی تھی۔ یوں ہی دن جاتے گئے اور زندگی کی بائیس بہاریں بے قراری اور انتظار کی نذر ہو گئیں۔ اب تو کسی کے لوٹ آنے کی نہ امید تھی اور نہ ہی چاہ باقی رہی تھی۔ جس شخص کو بھی دیکھا نہ ہو۔ بھی ہم کلامی نہ ہوئی ہو۔ صرف تین بولوں میں بندھ کر تقدیر کا بدلنا رخ دیکھا ہواس کے ساتھ کا سوچ کر کوئی خوشی ذہن میں نہ آتی تھی۔ اک روشن صبح میں تلاوت کر کے صحن میں نکلی کہ آج کے دانہ پانی کا کوئی بندوبست کر سکوں کواڑ کھلنے کی آواز آئی۔ ایک بزرگ جو کہ رشتے میں میرے شوہر کے چچا تھے سینہ چوڑا کیے بڑی خوشی سے اندر آتے دکھائی دیے۔ آتے ہی کہنے لگے کہ ”بھابی کو بلاؤ خوش خبری ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ خوش خبری کا ہماری زندگی سے کیا تعلق لیکن کام کرتے رہنے کی عادت بن گئی تھی۔ کام سمجھ کر اندر چلی گئی اور ساس کو بلا کے لے آئی۔ چاچا کہنے لگے کہ بیٹی وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ میں نے خواب دیکھا ہے۔“ ”اے لو جی! بزرگوں کو مذاق کی سوچھی ہے۔ خواب کی باتیں کب حقیقت ہوتی ہیں۔“ میرا دماغ غصے سے کھولنے لگا کہ اس قسم کی باتیں کر کے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یا ہماری بے بسی کا تماشادیکھنے آئے ہیں۔ میں پاؤں مارتی کمرے میں چلی گئی۔ لیکن ماں بہت دیر تک ان کے ساتھ بیٹھی رہیں۔ ان کے چہرے پر بھی خوشی چھلک رہی تھی۔ ان کی آنکھیں بار بار چمکنے لگتیں۔ چاچا اپنی نرنگ میں بہت کچھ بولے جا رہے تھے۔ اور میں اس انتظار میں تھی کہ یہ بزرگوار اٹھیں اور میں جا کے ماں کی امید توڑوں۔ بھلا خواب پر اعتبار کر کے بائیس سال کیسے بھلائے جاسکتے ہیں۔ ہماری تو تقدیر میں تنہائی لکھی ہے۔ ہم نے اسی تنہائی میں جینا تھا اور اس میں مرنا۔ چاچا اٹھ کر گئے تو میں نے جلدی سے دروازے پر زنجیر چھائی اور ماں کے پاس آ بیٹھی اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ بول اٹھیں۔ ”مایوسی کی باتیں مت کرنا۔ یہ بہت اللہ والا ہے۔ دیو بندبے قرآن وحديث پڑھ کر آیا ہے۔ اس کا خواب نظر کا دھوکا نہیں ہوسکتا ہے۔ میں ان کے لیے کا یقین بھانپ کر حیران رہ گئی۔ ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ میری بے یقینی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ پھر اپنے ایمان کو مضبوط کیا اور اللہ کو یاد کیا تو دل میں اطمینان سا اثر آیا۔ وہ اللہ والا ہے اس کا خواب جھوٹا نہیں ہوسکتا یہ بات ذہن میں گردش کرنے لگی۔ میں تو ابھی اسی کیفیت میں تھی لیکن ماں کو اور اور خیالات آنے لگے انہیں میں پہلے دن کی دلہن نظر آنے لگی۔ انہوں نے میری حالت زار کو دیکھا تو پشیمان ہوئے لگیں۔ میرے ہاتھ پیر کام کر کے پھٹ چکے تھے۔ چہرہ بے رونق اور زرد۔ بال الجھے ہوئے اور کپڑے انتہائی بوسیدہ۔ اس سے پہلے تو بھی ہمارا دھیان اس طرف کو گیا ہی نہیں تھا۔ مجھ میں تو آرائش و زیبائش کی بی حس پیدا ہونے سے پہلے ہی دفن ہو گئی تھی۔ بالوں میں چاندی چمک رہی تھی جیسے میں کوئی نازک خاتون نہیں ہوں بلکہ کوئی گھبرو جوان ہوں۔ جو پل میں کسی کو بھی پچھاڑ کے رکھ دے۔ اک عجیب ملغوبہ سی ظاہری صورت تھی میری۔ ماں

تمسخر میں اڑا دیا۔ نے کہا کہ آج کام کاج کی تلاش میں نہ تھکوں بلکہ خود پر توجہ دوں۔ میں نے ان کی اس فرمائش کو بھلا مجھے سنگھار سے کیا غرض ہوسکتی تھی۔ میں کام کے لیے بولی۔ شام کو تھکی باری آئی اور بستر پر پڑتے ہی گہری نیند میں چلی گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو گھر میں غیر معمولی سا کچھ تھا۔ سناتا توٹا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ چہل پہل ہے۔ میں صحن میں آئی۔ ماں نے مجھے سرتا پا دیکھا اور صحن میں پڑی اکلوتی چار پائی کی طرف اشارہ کیا کہ اس پر لیٹ جاؤ۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا لیکن وہ جواب دیے بغیر صندوق سے رضائی نکال لائیں اور مجھ پر ڈال دی۔ چار پائی کے ایک طرف راکہ گزاری اور کہنے لگیں۔ وہ ابھی آجائے گا۔ تمہارے کپڑے پھٹے پرانے ہیں اور بال الجھے ہوئے۔ ہاتھ پیر کھر دے اور رنگ زرد، بس تم ایسی حالت میں اس کے سامنے مت آنا۔ میں کہہ دوں گی بیمار ہے۔ ابھی الٹیاں کر کر کے نڈھال پڑی ہے۔ چار پائی کے ایک طرف راکہ تھپی ڈالی ہے کہ بدبو کا احساس نہ ہو۔ میں ان کے یقین پر حیران تھی۔ لیکن پھر ایک معجزہ ہوا جیسے کہ میری بے چینی بار گئی۔ ان کا یقین جیت گیا۔ میں ان کی فتح اور اپنی ہار پر خوش ہو رہی تھی۔ میرے دل میں جشن کا سال تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اندر ہی اندر شادیانے بچ رہے ہیں۔ صبح وہ آگئے سارا دن ملاقاتیوں کا ہجوم لگا رہا۔ اور میں بستر میں دبکی رہی۔ زندگی میں پہلی بار اتنا آرام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ لیکن یہ آرام مجھے اپنا دشمن لگ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اتھ کر ناچنے لگوں اور چیخ کر کہوں کہ میرا انتظار ختم ہو گیا۔ میری بے بسی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میرے سکوت میں ہل چل بر پا ہو رہی ہے۔ میں جو بحیرہ مردار کی طرح ہر احساس خود سے ٹکراتے ہی لوٹا دیتی تھی۔ آج ہر احساس کو اپنے اندر سمونا چاہتی ہوں۔ میں بچپنے میں اپنے گھر سے نکلی تھی اور آج شعور کی منزلیں طے کرنے کے بعد دوبارہ اپنے گھر کی زمین مجھے قبول کر رہی ہے۔ میں نے کئی سال مسافت میں گزارے ہیں۔ میں ابلہ یا ہوں لیکن اب مجھ پر تھنڈی پھوار پڑ رہی ہے۔ جیسے ہی لوگوں کا ہجوم کم ہوا میں پھرئی سے اٹھی اور رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھ پیر اور چہرہ دھونے لگی۔ نسبتاً کم بوسیدہ کپڑے زیب تن کیے اور بال سلجھانے لگی۔ کئی سالوں کی گرہیں تھیں ان بالوں میں۔ بڑی مشکل سے کچھ سنورے۔ سنورے وجود کے ساتھ میں بڑی ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔ ذہن پر چھایا غبار بھی کچھ اتر گیا۔ خاموشی تو ہمارے درمیان شاید قلعہ بنا چکی تھی۔ بس اک نظر اسے دیکھ لیا۔ یہی کافی تھا۔ یوں آیا تک دن سنور جائیں گے مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں تو اک سراب سے بندھی تھی۔ یہ نہ نا معلوم تھا کہ صحراؤں میں چشمے بھی پھوٹ پڑتے ہیں۔ قدرت نے مجھے صحرا کے بیچوں بیچ ابلتے ہوئے چشمے سے ہمکنار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ خاکروب سے جھگڑے کے بعد اس نے ٹھنڈے پہاڑوں کا رخ کر لیا۔ وہ ہمالیہ کے برف زاروں میں بھٹکتا رہا۔ اس کے ذہن سے پیچھے کے نقش مٹتے گئے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ پھر وہ ہمالیہ کے پار جا پہنچا۔ وہاں ایک اور ہی دنیا آباد تھی۔ خلق خدا کا اک سمندر تھا جو تھمتا نہ تھا۔ وہ سنکیانگ کے باغوں میں جا پہنچا۔ خدا کی قدرت تھی جو ہر چیز میں عیاں تھی۔ اس مٹی کی زرخیزی ایسی کہ قسم قسم کے میوے ایک ہی جگہ پر آگئے تھے۔ اللہ نے رزق کے دروازے اس بستی میں کھول رکھے تھے۔ برکت ایسی کہ جس کام میں ہاتھ ڈالو نفع ملے۔ بس وہاں کا موسم بڑا شدید تھا۔ گرمی میں گرمی بہت پڑتی تھی اور سردی میں سردی بہت بڑی تھی۔ لیکن اس شدت موسم سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ لوگ مسجنوں کو آباد رکھتے تھے۔ اس لیے اس شہر میں برکت ہی برکت تھی۔ وہ وہاں سے کشتیاں جلا کر نہیں لوٹا تھا۔ بلکہ اتنے سالوں بعد اسے بوڑھی اور کی ٹوبلی دلہن کی یاد سنائی تھی۔ اس کی بے چینی کو جب تھوڑا قرار آیا تو بے قراری کے لیے اسے گھر کی چاہت نے گھیر لیا تھا۔ اور اب تو انگریز سرکار کا زمانہ بھی چلا گیا تھا۔ اپنا پیارا پاکستان جو بن گیا تھا۔ وہ مجھے ہمسفر بنا کر پھر سے سنکیانگ کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں اس کا مال وزر تھا۔ اس کا کاور بار اور اس کی تو جوانی کی یادیں۔ وہ ان گلیوں کو کیسے بھلا سکتا تھا جنہوں نے اسے پناہ دی تھی۔ اسے کاشغر کے اونچے ٹیلے پر بنی مسجد کے مؤذن کی اوپنی طرف بلاتی تھی۔ الغرض ہم نے سامان سفر کیا اور چل پڑے۔ کسی مرد کے ساتھ اتنی معتبر حیثیت سے گاؤں سے باہر قدم رکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن زندگی کے تلخ تجربوں نے میری دلچسپیوں کو محدود کر دیا تھا۔ مجھے ان دیکھی چیزیں بھی دیکھی بھالی معلوم ہوتی تھیں۔ یوں محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میں کسی نئے سفر پر روانہ ہوں۔ میری تو ساری زندگی سفر میں گزری تھی۔ پیار، محبت، احترام اور ہمدردی کا ہر احساس میرے لیے نیا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ میں ان کی احساسات کی بھی عادی ہوں۔ اور محبت جتانے اور احترام نیہانے سے اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے وجود میں اب خاموشی اور ٹھنڈا اتر گئی تھی کوئی آگ نہیں جس کو بجھانے کی فکر ہوتی مجھے۔ ہر آگ بجھ چکی تھی۔ کوئی انگارہ بھی نہ بچا تھا کہ چنگاری سے سلگتا۔ سب راکہ کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ ہمالیہ کے بل زار راستے میرے قدموں سے ایسے گزرے جیسے کوئی پرندہ رات میں اپنے گھونسلے کی سمت جاتا ہے۔ نہ اس کے قدم زمین کو چھوتے ہیں۔ اور نہ ہی اس کی آنکھیں اس حسن کو دیکھ پاتی ہیں۔ ایک سیاہ پردہ ہوتا ہے جو نگاہوں کے سامنے مائل ہوتا ہے۔ میں اس حقیقت کا اعتراف لفظوں میں کرنا چاہتی تھی۔ کہ میری زندگی بدل گئی ہے۔ لیکن الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ خوشی نے مجھے گونگا کر دیا تھا۔ میں ہونقوں کی طرح زندگی کی رنگینی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ میری یہ کیفیت میرے سوا کوئی نہیں جان پایا تھا۔ سب مجھے وہاں بھی اک مضبوط عورت ہی سمجھتے رہے۔ کسی نے میرے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ آسانشیں میرے لیے بہت نئی تھیں۔ میں انہیں آسانی سے پاتی تو یقیناً مغرور ہو جاتی۔ ہر ایک ہی خیال میرے اردگرد منڈلاتا تھا کہ جو سختیاں مجھ پر گزریں وہ بھی میرے لیے بالکل نئی تھیں۔ جیسے تقدیر نے بائیس سال پہلے پلٹا کھایا تھا ویسے ہی کھایا تھا۔ اب میرا گھر میرا مسکن تھا۔ اور ہر سہولت بھی موجود تھی۔ ہر کام جلدی اور صفائی سے ہو جاتا تھا۔ اس نے مجھے رسموں رواجوں سے بڑھ کر احترام دیا۔ وہ باورچی خانے میں میرے ساتھ کھانا پکواتا اور غسل خانے میں میرے ساتھ کپڑے دھواتا تھا۔ فرش چمکانے میں دو مجھ سے زیادہ ماہر تھا۔ اس کا کاروبار پھیلا ہوا تھا وہ ملازمہ بھی رکھ سکتا تھا لیکن وہ میرا بوجھ بانٹنا چاہتا تھا۔ میں جب سودا خرید نے بازار جاتی تو بازاروں میں بکنے والے خانے مجھے بڑا مرعوب کرتے۔ آج سے پہلے تو کبھی لذت پر دھیان نہ گیا تھا میں بھوک مٹانے کے لیے جو رو کا سوکھا ہوتا کھا یا کرتی تھی۔ وہاں کے کھانوں میں میں نے زیرہ، تماشہ جانفل اور دار چینی دیکھے۔ وہیں پر میں نے شوق سے کھانا پکانا سیکھا۔ رب کی نوازشیں ہر بندش کا توڑ ہوتی ہیں اللہ پاک نے مجھے چمکتے بالوں کے ساتھ اولاد عطا کی۔ پہلے میرے گھر بیٹی رحمت بن کر آئی اور چند سالوں بعد چاند سا بیٹا۔ بچوں کی پیدا نش کے بعد میں پھر سے بہت مصروف ہو گئی۔ میں اپنے بچوں کو ہر محرومی سے دور کھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں خود کو بدل نہ سکی۔ خاموشی کا وہ حصار جو ہمارے درمیان تھا جوں کا توں قائم رہا۔ متمول گھرانے کے جوڑے شام کو چائے کی پیالیاں

شروع کرتی لیکن مجہ اٹھائے کھلکھلایا کرتے تھے۔ میری مسکراہٹ بھی خلا میں گم ہو جاتی۔ میں کوشش کر کے بات سے جملہ ادا نا ہوتا تھا۔ میرے تھے ادھورے رہ جاتے۔ میرے پاس محبت کا اظہار یہ تھا کہ خوشبودار سالن اور ترکاریاں پکاؤں۔ میری بنائی ہوئی چائے سفید چنمبیلی سے مہکے میرے پرائیڈ میں عقاب کیسرخی چھلکے۔ پرانے گملوں سے پودینے کی بھینی بھینی ٹھنڈی خوشبو اٹھتی رہے۔ اور گلاب کی سرخ کلیاں پانی کے جگ میں تیرا کی کر یں اور گھونٹ گھونٹ میں میری محبت کا احساس اترتا جائے۔ میں اپنی محبت کو پانی دیتی رہی بس اسے دھوپ میں بچایا اور چھاؤں میں دھوپ نہ دے سکی۔ میں اک ایسا برف زار تھی کہ جس پر ہر آنے والے سال برف کی ایک کی نہ جم جاتی ہے۔ اور چاندنی رات کا کوڑا اسے سخت سے سخت تر کر دیتا۔ وہ تلافی کی ميعاد پوری کر چکا تھا۔ اسے اب ساتھ چاہیے تھا۔ وہ نیاہ نیاہ کے تھگ چکا تھا۔ اب اسے چاہیے جانے کی چاہ تھی۔ وہ مجھے زندگی لوٹانے میں ناکام ہو گیا تھا۔ اس نے وہاں سے کاروبار سمیٹا اور ہم واپس اپنے وطن آگئے۔ یہاں اس نے نئے سرے سے کام شروع کیا۔ وہ اک مہمان تاجر تھا۔ مٹی میں ہاتھ ڈالنا تو سونا بن جاتی۔ وہ کاروباری سفر کرتے کرتے مشرقی پاکستان جا پہنچا۔ مشرقی پاکستان اسے بھا گیا۔ اس کے سفر فوائد اختیار کر گئے۔ اور ایک دن مال تجارت کے ساتھ رضیہ کو بھی لے آیا۔ رضیہ بہت خوب صورت تھی۔ عمر کی پکی تھی لیکن لہجے میں کھنگ۔ بولتی تو باتوں سے پھول جھڑے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی چمک بھی سننے والے کو نظریں پٹانے نہ دیتی۔ وہ جمال و جلال کا مرکب تھی۔ جب حسن بھی ہو اور جلال بھی تو اس دنیا میں اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟ میں اس کے جلال تلے تو آنے والی نہیں تھی لیکن اس کے جمال تلے دب کر مجھے اپنا آپ کہانی کا پس منظر لگنے لگا۔ اس کے سیاہ گھنے بال اماوس کی رات کی طرح پراسرار تھے۔ وہ جب انہیں کھولے انگن میں چلتی تو اس کے سحر سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ اس کی پٹ سن کے سنہری ریشوں جیسی رنگت۔ سردی کی دھوپ جیسی تمازت دیتی تھی۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس نے مجھے نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح میر احترام کرتی جیسے کہ میرا شوہر میرا احترام کرتا تھا۔ بس اسی لیے مجھے بھی اس سے انسیت ہو گئی۔ رضیہ پڑھی لکھی خاتون تھی۔ شہر کے کالج میں پڑھانے لگی۔ میرے بچے بھی اس کے زیر نگرانی تھے۔ ان کی تعلیم تربیت بھی بہت اچھے سے ہونے لگی۔ زندگی میں اک متوازن کی روانی آگئی۔ چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میری زبان کی گریں بھی کھلنے لگیں۔ ہم نے مل کر اپنی بچی کی دھوم دھام سے شادی کی۔ رضیہ نے اسے بازار سے جدید طرز کے ملبوس دلائے۔ اب ہم کوئی چاند کا ٹکرا بہو کے روپ میں گھر لانے کی سوچنے لگے۔ بس ان ہی دنوں ہمیں پیچھے دھکیلنے کو مرگ آپڑی۔ میرے تندرست شوہر نے مجھے سے اور رضیہ سے کنارہ کشی کر لی اور اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ رزق کے وسیلے تو رب کے فضل سے بہت تھے لیکن اس کے جانے کے بعد مجھے اس کرب نے آگھیرا کہ شاید اسے میری بے اعتنائی کا غم کھا گیا ہے۔ اسے رضیہ سے محبت نہیں تھی۔ اسے تو وہ میری زبان کی گریں کھولنے کو لایا تھا۔ اسے اماوس کی رات سے لگاؤ نہیں تھا وہ تو چاندنی کا شیدائی تھا۔ اسے قلم تھامنے والے نرم و نازک ہاتھ سرور نہیں دیتے تھے۔ اسے تو بائیس سال تک گارا گوندھ کر اس کے کچے گھر کی دیواروں کو کھڑا رکھنے والے کھر درے ہاتھوں کی تمنا تھی لیکن بہت دیر ہو گئی۔ خالہ بی کے انسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ شاید وہ اپنی ساری زندگی میں افسردہ آخری حصے میں جا کر ہوئیں۔ ان کا بیٹا، پوتے پوتیاں، بہو اور رضیہ سب ان کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنی محبت کو پانی دینے کے لیے سنکیا تنگ کی گلیوں کے کھانے اب بھی پکاتی ہیں۔]